

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے  
حکمران ہے اک وہی باقی بتائیں آذمہ کی

فتران کی رُوسے

# کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں

۱۹۷۹ء  
جشن نزول قرآن کی تقریب منعقدہ اگست پر  
پرویز صاحب کا خطاب



نَشَاوَةً لَّهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (پڑ) — اور وہ اس آتش خاموش و پنهان میں جلتے جھنٹے رہتے ہیں۔

زبانہ نزول قرآن میں دنیا میں انسان کی جسمانی بیماریوں کے لئے تو سب سے الفاظ درج تھے لیکن دل کی بیماریوں کے لئے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی تھی۔ اور اصل یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک بھی ان بیماریوں کا کوئی خاص تصور متعین نہیں ہوا تھا۔ — حسد، کینہ، منافقت، مکاری، فریب کاری، خود غرضی، مفاد پرستی، دنیایت وغیرہ کو اخلاقی برائیاں سمجھا جاتا تھا۔ انہیں امراض سے تعبیر نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے انہیں "امراض قلب" کہہ کر یکجا کر دیے۔ چودہ سو سال بعد جب نفسیاتی تحقیقات کا دائرہ وسیع اور قدرے عمیق ہوا تو یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ برائیاں اور خباثتیں درحقیقت نفسیاتی امراض (PSYCHOLOGICAL COMPLEXES) ہیں۔ یہی وہ امراض ہیں جن کے علاج کے لئے قرآنی نسخہ کو "شِفَاؤُ الرُّسُلِ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر صرف اس ایک حقیقت پر ہی غور کیا جائے تو وحیِ خداوندی کی اہمیت اور قرآن مجید کی عظمت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اب آگے بڑھیں اور قرآن کریم میں پیش کردہ دوسری بنیادی حقیقت کو سامنے لائیں۔ علماء علم النفس سالہا سال کی تجسس و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان نفسیاتی امراض کی علامات اور ان کے نمودار ہونے کی شکلیں اور صورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ یعنی خوف! خوف، خواہ اس کا سبب کچھ بھی کیوں نہ ہو، انسان کے دل کی گہرائیوں میں (یعنی اس کے لا شعور میں) پوسست ہو کر اس کی ذات میں لگاؤ پیدا کر دیتا ہے جو مختلف نفسیاتی امراض کی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر ان کے لا شعور سے خوف کے احساس کو دور کر دیا جائے تو ان امراض کو شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر تفصیل سے عرض کروں گا، قرآن ہی کہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو

### نفسیاتی امراض کا بنیادی سبب

طرحے بیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسلام سے پہلے تین مذاہب عالمگیر حینیت رکھتے تھے (۱) بدھ مت (۲) عیسائیت، جس میں اصل کے اعتبار سے یہودیت بھی شامل تھی (۳) زرتشت کی مجوسیت۔ بدھ مت، میں اصل تعلیم یہ تھی کہ دنیا کرب اور اذیت (PAIN) کا گہوارہ ہے۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اور گناہ (SIN) لازم و ملزوم ہیں۔ اور مجوسیت کا فلسفہ یہ تھا کہ دنیا میں خیر اور شر کی جنگ جاری ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے :-

اسلام نظامِ قدرت میں کرب و اذیت، گناہ اور کشمکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موافقات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے مسئلہ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف و حزن سے یکسر آزاد ہو جائے۔ .... اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلانے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات لامنتہی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ (آگے چل کر اقبالؒ کہتا ہے) اسے پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر بُرائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL, PP. 34-35)

اقبالؒ کا سالہا پیغامِ مسترآن مجید کی روشنی میں انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کر کے اس کے دل سے خوف

کے احساس کو متا دینا ہے۔ بالفاظ دیگر: اقبالؒ کا پیغام خودی کے خلاف مسلسل جہاد ہے۔ مثلاً وہ اپنی مثنوی ”موزرے خودی“ میں لکھتے ہیں :-

جہاد ہے مثلاً وہ اپنی دشمنی ”مورے خودی“ میں لکھتے ہیں :-

بر شیر بنهار / در قلب شست  
اصل او بیم است اگر بینی درست  
لا به و مگر / در  
ایم از خوف می گیر دست و رخ  
پرده از / در  
فلقه را از غوشن مادر دامش  
آنکه از بیم / در  
می شود خوشنود، با تا سازگار  
مقطعه فیمده است

صطفیٰ حمیدہ است

وہوڑیے شہر دی حد ۱۱۰۰

نوف مشہر دیدہ است

ت کے اندر کسرا ح مضمیر ہوتا ہے ۱۱

تت فزا آگے چل کہ کی جائے گی ۔ سر درست یہ دیکھئے کہ ظہور اسلام

سے ہے خوف کی وجہ سے انسان کی حالت کیا ہو چکی تھی۔ اقبالؒ بھی اس کے حفاظ ہیں۔

بود انال در جهان انال پرست  
سطوت کسری و قیصر رهنش  
کاین دپا پاؤ سلطان و امیر  
صاحب اورنگ و هم پیر گشت  
در کلیسا اسقف رفواں قروش  
ناکس و نابود مند و زیر دست  
بتدا در دست و پاؤ گردش  
بهر یک پنجر بسد پنجر گیر  
یاج برگشت خراب او نوشت  
میر اس میدان لول داسه پد کش

از غلامی فطرتِ ابدوں شدہ      انعمہ ہا اندر تھے اوخوں شدہ (سوزِ بے خودی شدہ)

اسلام کے وقت نورجانب کی یہی حالت تھی۔ وہ مستبد حکمرانوں کی ذلت آمیز اور سازیت ناک زنجیروں میں جکڑ چکا اور  
یہ ہمیشہ اذیت کے غنڈہ باز ناک اور قہر آلود بندھنوں میں بندھا ہوا تھا کہ رسالتِ محمدیہ نے: **يُضَمُّ عَلَيْهِمْ رِجَالٌ هُمْ ذُلَّ**  
**لِالْبَيْتِ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (پڑھو) نورجانب کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہمارے ان بندھنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔**  
بال ہی کے الفاظ میں:

تا اینی من بخدا را سپرد  
شعله از مرده خاکستر کشاد  
قوت او هر گزین پیکر شکست  
تازه چنان اندر تن آدم دمید  
بندگان را مستند خاتان سپرد  
کوکن را پاییه پر دین داد  
نور انسا را حصیه تازه بست  
بنده را باز از خداوندان حسدید

(رموز کے بخودی صد ۱۲۰-۵۹)

قرآن کریم اس انقلاب آفرین پیغام اور انسانیت ساز و حریت بخش تعلیم کا حاصل چار ایسے الفاظ ہیں بیان کر دیا ہے جن کی حاملہ انسان کی بصیرت و جد کرتے لگ جاتی ہے۔ فرمایا: فَمَنْ تَبِعَ هَذِهِمْ فَلَا حُزْنَ عَلَيْهِمْ وَلَا حُزْمًا يَحْزَنُونَ (۱۸۸)۔ ”جو لوگ ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے انہیں نہ کسی قسم کا خوف و اضطراب ہوگا نہ حزن“ قرآن کریم نے یہاں دو الفاظ استعمال کئے ہیں — خوف اور حزن — معنویت کے اعتبار سے ان



## خوف و حزن

دونوں میں ایسا لطیف فرق ہے جسے دیدہ بینا ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ عام فہم الفاظ میں خوف کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ اُس خطرہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آجائے۔ ہم سانپ سے ڈرتے ہیں۔ شیر سے خوف کھاتے ہیں۔ لیکن حزن دل کی اس درد انگیز افسردگی اور اندوہناک آرزو کی کانام ہے جسے ہم نہ کسی کو دکھا سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے۔ اور اکثر اوقات تو اس کا کوئی محسوس سبب خود ہمارے سمجھ میں بھی نہیں آتا۔

قرآن مجید کے انگریزی تراجم میں خوف کا ترجمہ (FEAR) اور حزن کا (GRIEF) کیا جاتا ہے۔ درستی طور پر تو ان الفاظ سے کام چل جاتا ہے لیکن حزن سے جو چوٹ دل پر پڑتی ہے وہ ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ ہمارے ہاں کی شاعری (یا مخصوص تغزل) کا چوتھا محبوب تریں موضوع حزن و ملال ہے اس لئے اس میں اسس قلبی اضطراب کا اظہار مختلف انداز سے کیا جاتا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کا ایک بڑا دلچسپ و عمیق شعر ہے جس میں انہوں نے خوف اور حزن کے فرق کو بڑے لطیف ویرانہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

سدا ہے تیرے کہ سرنگم می خورد و گشت خبر بگیر کہ آواز تیرہ و جگر است

جب تیرے چٹان پر پڑتا ہے تو اس کی آوازیں اور جب وہ جگر پر پڑتا ہے اس کی صدا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہمارا ایک اردو غزل گو شاعر اس فرق کو ذرا شوخ انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

کسے بتائے کوئی خون آرزو کیا ہے انہیں یہ صند ہے کہ دکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

خوف کا مشابہہ رنگ و بو سے ہوتا ہے اور حزن کا احساس ”خون آرزو“ سے۔ خون آرزو کا کسی دوسرے کو دکھانا تو ایک طرف جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، بعض اوقات تو ان کو خود بھی پتہ نہیں چلتا کہ میری افسردگی اور آرزو کی جو میری چربی ہمار کو حزن بنا دیتی ہے اس کا سبب کیا ہے جگر اس قسم کے انجانے غم کے متعلق کہتا ہے کہ وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں مگر دل ہے کہ ڈوبایا رہا ہے

یہ کیوں ڈوبایا رہا ہے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ ہے حزن۔ غمی دنیا میں خوف اور حزن کے فرق کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک مستبد حکمران اپنے مخالف سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی ریشہ نشین سے باز نہ آئے تو اس تلوار کو دیکھ لو۔ اس سے دس کے دلی میں خوف پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے فلاں درگاہ پر ایک منت مانی تھی جسے میں نے پورا نہیں کیا۔ اب مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا معلوم مجھ پر کونسا غضب نازل ہوگا۔ یہ حزن ہے۔ وسیع مغفول ہیں یہ سمجھ کر انسانی حکمرانی کی طرف سے محکوم انسانوں کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں اسے خوف سے تعبیر کیا جائے گا اور ارباب شریعت اور اصحاب طریقت جس قدر خداوندی سے ڈرتے رہتے ہیں وہ حزن کہلائے گا۔ قرآن کریم نوع انسان کو ان ہر دو سے نجات دلائے کی ضمانت دیتا ہے۔ جب انسانوں کو اس درد (خوف اور حزن) سے نجات مل جائے گی تو ان سے پیدا شدہ امراض (نفیاتی پیچیدگیوں) سے شفا حاصل ہو جائے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ قرآن اس خوف اور حزن کو دور کس طرح کرتا ہے؟ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بعض انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں تو محکوموں کے دل میں خوف اور حزن پیدا ہوتا ہے۔ سیاسی حکمران انسانوں کے جموں پر حکومت کرتے ہیں۔ اور مذہبی پیشوا ان کے قلب و دماغ پر۔ قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس کا علاج بتا دیا ہے۔ محاورہ کے طور پر نہیں۔ سچ مح و لفظ میں۔ اور وہ دو لفظ ہیں۔ لا الہ۔ الہ کے معنی ہیں صاحب اقتدار۔ وہ جسے حق حکومت حاصل ہو۔ لہذا لا الہ

## لا الہ

اسکے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات میں کوئی صاحب قوت ایسا نہیں جسے دوسرے انسانوں پر حق حکومت حاصل ہو۔ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، وہ جن قوانین کے تابع سرگرم عمل ہے، کوئی قوت ایسی نہیں جو ان قوانین کی نگہ اپنے قوانین نافذ کر سکے، یا ان میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ لہذا، خارجی کائنات میں لا الہ کا عمل از خود کار فرما ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

نقطہ ادوار عالم، لا الہ  
چرخ را از دور او گردندگی  
انتہائے کار عالم، لا الہ  
ہر را پائندگی، رحمتندگی  
بجز گوہر آفرید از تاب او  
موج در دریا پدید از تاب او (مؤید بخودی ص ۱۶)

یہ مسلک خارجی کائنات کا ہے۔ افسافی دنیا میں انسانوں پر انسان حکومت کرتے ہیں۔ اگر انسان اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ لا الہ — کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں، تو وہ خوف و حزن سے مامون ہو جائے گا۔ لہذا، خوف و حزن سے نجات پانے کے پروگرام کی منزل اول یہ ہے کہ لا الہ کو اپنے دل کا یقین اور زندگی کا معرل بنایا جائے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

در جہاں آغاز کار از حرفت لا است  
پیش غیر اللہ لا گفتن چیست  
ایں نخستین منزل مرد خدا مست  
نازہ از ہنگامہ ادکائات  
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز ؟  
تخم لا در مشت خاک او بریز  
بر کرا ایں سوز با شد در جگر  
لا مقام ضرب بابے پے بہ پے  
آگے چل کر وہ ادبائے شریعت اور اصحاب طریقت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

ایک اندر مجرہ با ساری سخن  
ایکدمی بینی، نیر نہ باد جو  
نعرہ لا پیش نمرود سے نبر  
از حبل لا الہ آگاہ خلق  
ہر کہ اندر دست و شمشیر لا است  
جملہ موجودات را فرمانروا است (ص ۱۷)

لا الہ کو مسلک زندگی قرار دے لینے والے کو قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے، اور اقبالؒ اسے مردِ حر کہتا ہے۔ یعنی جو خوف و حزن سے آزاد ہو۔ مردِ حر کے متعلق وہ کہتے ہیں :-

مردِ حر از لا الہ روشن ضمیر  
ماکیں سادوست، ماسجد فردوش  
می نہ گردد بندہ سلطانِ غیر  
از دست مصطفیٰ پیمانہ نوش  
دارد اندر سینہ تجسسِ اعم  
در جہاں بے ثبات اورا ثبات  
مرگ اورا از مقامات حیات (ایضاً ص ۳۱)

جاوید نامہ کے آخر میں انہوں نے (جاوید کی وساطت سے) ہماری نثار و نذر کو ایک پیغام دیا ہے۔ پیغام کیا ہے ؟

صویر اسرائیل ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

اے پسرِ اذوق، نگہ از من بگیر  
موجن در لا الہ از من بگیر

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ  
إِلهٌ فِي الدِّينِ لَا تَغْتَابُ  
لَهُ فِي السَّمَاءِ عِشْرِينَ  
مِثْقَالًا وَفِي الْأَرْضِ  
مِثْقَالًا وَهُوَ الْعَلِيُّ  
الْعَلِيمُ

تاریخ اندام تو آپ بوسے جاس  
لاالہ جز پتہ نبی و نہایت  
لاالہ ضرب است و ضرب کاری است

(سید و پیر نامہ اور قصیدہ)

اقبالؔ نے کہا ہے کہ

ایں دوسرے لالہ گفتار نیست  
لالہ جز تیغ ہے زہار نیست

عبدالاولیٰ کے مسلمان (یعنی مردانِ حُر) اس حقیقت کو کس طرح سمجھ چکے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جو کتبِ دیلیات میں گورہر تابدار کی طرح تابا بندہ ہے۔ وجہ یہی اکریم کی مکتی زندگی میں قرآنی انقلاب کے امکانات بعید سے نظر آنے لگے تو انصافِ مدینہ کا ایک دند آج کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ پیش کش کی کہ آپ مدینہ تشریف لے چلیے کہ وہاں کی فضا اس انقلاب کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ آپ نے اس تجویز پر اظہارِ رضا مندی فرمایا اور ان سے کہا کہ آپ اس امر کا عہد کریں کہ اس راستے میں کتنی مشکلات بھی کیوں نہ پیش آئیں آپ اس دعوت کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کی تختی کی علامت کے طور پر آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنا شروع کیا و بیعت کا مفہوم یہ تھا کہ ہم اس مقصد کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ آپ کے ہاتھ فر دیتے ہیں) اس وفد کا سربراہ دروازے میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ آپ لوگ یہ عہد تو کر رہے ہیں لیکن آپ نے اس کے مستلح اور عواقب پر بھی غور کر لیا ہے؟ یہ لالہ کا اقرب عرب اور عجم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر یہ عہد کر دو۔

آپ نے دیکھا کہ وہ حضرات لالہ کامنہم کس واشگاف انداز میں سمجھ چکے تھے۔ لالہ کے سبھی مضمورات میں جن کے پیش نظر قبائل نے کہا تھا کہ

تجربہ تو ہر انسان و زم نگہ را کہ بینم اندر دین مہر و مہ را

چونی گویم مسلمانم، بفرستم که دانم مشکلات لاله را (اصحاب حجاز است)

اُنس در در میں اس عہد کا نام یہاں تھا جسے قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے : اِنَّ اللّٰهَ اشَدُّ تَزَاوُلًا مِنْ الْقَوَائِمِ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَكْمَرُوْا اَنْفُسَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْمُجْتَنَّةَ (۱)۔ اس ایمان کی رو سے مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا تھا اور خدا اس کے عوض اسے جنت عطا کر دیتا تھا۔ وہ جنت میں کے متعلق واضح طور پر کہہ دیا جاتا تھا کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ ذَلَا اَنْتُمْ لَھُمْ تَحْذَرُوْنَ (۲)۔ اس میں تمہیں نہ خوف ہو گا نہ حزن۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ایمان کے اس جز و اقل کا مہمل مفہوم کیا تھا یہ ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں۔

نه هر کس خود را در هم خود گذاز است نه هر کس مست تانده اندر نیاز است

کہ یہ بالائے نامردوں درازا است (ارتقاء حجاز ص ۴۷)

یہاں تک یہ بتایا گیا ہے کہ لا الہ کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جسے حق حکومت حاصل ہو۔ لیکن انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے حکومت کا وجود ناگزیر ہے۔ حکومت کے معنی میں ایسی پابندیاں عائد کرنا جن سے افراد معاشرہ کے



بہی روابط عدل و انصاف کی بنیاد مل رہی ہو۔ استوار اور حکم ہوں۔ اگر معاشرہ میں ایسی پابندیاں قائم نہ کی جائیں تو اس میں اتار کی پھیل جائے گی۔ — فساد برپا ہو جائے گا۔ اس کے لئے قرآن کریم نے اس ایمان کا دوسرا جز الا اللہ اس کے ساتھ جوست کر کے توحید کے پروگرام کی تکمیل کر دی۔ لا الہ الا اللہ - یعنی دنیا میں خدا کے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ اس کا پہلا حصہ اگر ہر قوت کی نفی کرتا ہے تو دوسرا حصہ خدا کے حق حکومت کا اثبات ہے۔

**الا اللہ**

در مقام لایا صاید حیات سوئے الای خدا مد کا ثبات

لاوالا ساز و برگ اُمتان نفی بے اثبات مرگ اُمتان (لہجہ بایکہ ص ۳۳)

قرآن کریم نے اس پورے فارمولے کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا جب کہ **الَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ** "کون سا نظام زندگی اختیار کیا جائے" اس باب میں کسی پر کوئی چہر نہیں۔ **قَسَتْ لَیْسَ یَکُنِ الشُّشْ شَدُّ مِیْنِ النَّعْیِ** - صحیح راستہ اور غلط راہ کھڑ کر سامنے آ چکی ہیں۔ صحیح راہ خدا کی حکمرانی ہے اور غلط راہ انسانوں کی حکمرانی۔ **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللِّغَظِ غَوَتْ وَاُولٰٓئِکَ مِیْسُ بِاللّٰہِ** **فَقَدْ اَسْتَمْسَلَتْ بِالْعَصْرِ ذٰلِکَ اَلْوَثْقِ اِلَّا اِنْفِصَامَ لَہَا دِیْمَہ** - جس نے انسانوں کی حکمرانی سے انکار کر کے خدا کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا تو اس نے ایسے سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

**خدا کی عبادت**

حکمرانی کے لئے عربی زبان اور قرآن کریم میں "عبادت" کی اصطلاح آئی ہے۔ "خدا کی عبادت" کے معنی میں خدا کی حکومت اختیار کرنا ہے۔ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم کے امتیاز (یعنی سورہ فاتحہ) میں دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ اسے ایک عبد مؤمن نماز کی ہر رکعت میں دہراتا ہے جب وہ (یوں کہیے کہ) با وضو، تہذہ خدا میں کھڑے ہو کر اور قبیلہ کی طرف منہ کر کے اپنے خدا سے کہتا ہے کہ

**اٰیَالہ نَعْبُدُ**

ہم تیری اور صرف تیری حکومت اختیار کرتے ہیں۔ یہ لا الہ الا اللہ کی عملی تفسیر ہے۔ یہ اعلان کس طرح عرب اور عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے اسے اقبالؒ نے ایک شعر میں یوں سمٹا دیا ہے کہ

تا دور تیغ لا و الا دشتیم ماسوا اللہ رائشاں نگدا شیم (سار ص ۳۳)

جب ہمارے ہاتھیں کا اور الا کی تلواریں تھیں تو ہم نے اللہ کے سوا ہر حکمران کا نام و نشان تک مٹا دیا تھا۔ خدا کا ہر رسول **حضرت موسیٰ علیہ السلام** پر دو گرام لکھ کر آنا تھا جب حضرت موسیٰؑ کو طور کی چوٹی پہ پہلی بار پکارا گیا تو ان سے کہا گیا **اِسْمِیْ اَنَا اللّٰہُ ہَمَّ اللّٰہُ مِیْنِ** "لا الہ الا انا" ہمارے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ **قَلْبُکُمْ دِیْنِ**

(دیکھو)۔ لہذا تم ہماری اور صرف ہماری حکومت اختیار کرو اور یہی پیغام لے کر فرعون کی طرف جاؤ جو اپنی حکمرانی کا سب سے بڑا عویذ تھا، خدا کا سرکش ہے۔ یہی وہ پیغام تھا کہ جسے ایک اور فرعون کے عہد حکومت میں حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں کو ان الفاظ میں دیا تھا: **اِنَّ اللّٰہَکُمْ اِلٰہٌ وَّ اِلٰہُکُمْ اِلَّا اللّٰہُ** یا رکھو! حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی اور کو نہیں۔ **اَمَسْرَ اَنْ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اَیَّاهُ** - اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کرو۔ **خَالِکَ الدِّیْنِ اِنَّمَا** - یہی حکم نظام ہے۔ **وَلَیْکُنْ اَشْرَ النَّاسِ اِلٰہٌ وَّ یَعْبُدُوْنَ دِیْنَہ** (لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے جھک کر اپنے لئے ذات و خواری کا ملان پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی انقلاب آفرین پیغام لے کر حضور نبی اکرمؐ تشریف لائے اور ماری دنیا سے پکار کر کہہ دیا کہ **اِسْمَا اُسْرَتِ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہُ**



وَلَا أُشْرِكُ بِهِ (ہم) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف خدا کی حکومت اختیار کر لوں اور اس کے حق حکومت میں کسی کو شریک نہ کروں۔ یا اور کہجئے: خدا کی حکمرانی سے یکسر انکار کر کے سیکولر نظام اختیار کر لینا کفر ہے۔ اور خدا کے نام سے انسانوں کے وضع کردہ قوانین نافذ نہ کرنا شرک ہے۔

قریش مکہ نے حضور کی دعوت کی جس قدر مخالفت کی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ یہ بات مذہبی پیشوائیت کی طرف سے کبھی وضاحت سے سامنے نہیں لائی جاتی۔ کہا جاتا ہے تو صرف اتنا کہ حضور ان کے بتوں کو برا کہتے تھے اور یہ چیز انہیں سخت ناگوار گزرتی تھی۔ اقل تو یہی بات صحیح نہیں کیونکہ دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر وجہ نزاع یہی تھی تو ہجرت کے بعد قریش نے اس قدر لٹائیاں کیوں لڑیں؟ حقیقی وجہ نزاع وہ تھی جسے قرآن کریم نے اعلان جنگ قرار دیا ہے اور اسے ایسے زلزلہ انگیز اشارے دیے ہیں جس سے دلوں کی بستی تک میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لَوْ يَأْتِيهِمُ الْكُفْرُ مِنْ دُونِ يَدٍ لَدَارَ لَئِنْ لَمْ يَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَتُكَ لَفُتِّنَاكَ بِالْعَدُوِّ فَأْتَيْنَاكَ أَهْلَ بَيْتِكَ وَمَنْ عَرَفَ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ (آل عمران: ۵۵) یہ لوگ جو خدا کی حکمرانی سے انکار کرتے ہیں اے رسول! انہیں یہ الٹی میٹم دے دو کہ لَوْ يَأْتِيهِمُ الْكُفْرُ مِنْ دُونِ يَدٍ لَدَارَ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ (آل عمران: ۵۵) اگر انہوں نے اس کی حکمرانی سے انکار کر دیا تو ان کی لعنت ہو۔

قریش مکہ کے خلاف اعلان جنگ | اور تمہاری موجودہ ریش سے ظاہر ہے کہ جس خدا کی حکومت کی میں دعوت دیتا ہوں تم اسے آسانی سے اختیار نہیں کرو گے اور

مجھے مجبور کر دے گا کہ میں اپنی اس دعوت کو چھوڑ کر تمہارا مسک اختیار کر لوں۔ لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وَلَا آتَاكُمُ الْعِلْمُ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (آل عمران: ۶۴) جس طرح تم میری دعوت کو قبول نہیں کرو گے میں بھی تمہارا مسک اختیار نہیں کر دوں گا۔ یہ میری طرف سے کھلا کھلا اعلان جنگ ہے۔ لَكُمُ الدِّينُ كَمَا دَرَيْتُمْ دَرَيْتُمْ (آل عمران: ۶۴) تمہارا نظام زندگی تمہارے لئے اور میرا نظام زندگی میرے لئے اس لئے تم میں اور مجھ میں نہ مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان دونوں نظاموں میں کوئی قدر مشترک نکل سکتی ہے۔

ان آیات اور ان جیسی سیکولر دیگر آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اور إِيَّاكَ نَعْبُدُكَ اسلام کی اساس اور بنیاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔

اس نظام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تو ہمارے سامنے نہیں آتا اس لئے اس کی حکومت اختیار کس طرح کی جائے؟ اس کے جواب میں بھی قرآن کریم نے حکومت کا ایسا تصور پیش کیا جس سے اُس زمانے کا انسان قطعاً نا آشنا تھا اور اب بھی رفتہ رفتہ اس تک پہنچ رہا ہے۔ اس زمانے میں حکومت صرف اشخاص کی سمجھی جاتی تھی۔ اشخاص کے بدلنے سے حکومتیں بدل جاتی تھیں لیکن قرآن کریم نے کہا کہ حکمرانی اشخاص کی نہیں بلکہ قانون کی ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ایک ضابطہ قوانین دیا ہے۔ اس ضابطہ کی حکومت

قانون کی حکمرانی | اختیار کی جائے گی تو وہ خدا کی حکومت ہوگی چنانچہ اس نے فرمایا: إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۚ فَلْيُحْلِلِ اللَّهُ لَهُ مَا تَشَاءُ مِنَ الدِّينِ (المائدہ: ۱) اے رسول! ہم نے تیری

طرف اس ضابطہ قوانین کو نازل کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے خالصتاً اس ضابطہ کی اطاعت کرو۔ یہی خدا کی عبادت یعنی حکومت ہوگی۔ دوسری جگہ کہا: أَفَعَلَيْكَ اللَّهُ ابْتِغَاءَ وَجْهِكَ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ

اَلْكِتَابُ مُفَصَّلًا (۱۰) ”اے میری دعوت کے مخالفو! کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جو بڑا منضبط ہے۔“

چنانچہ نبی اکرمؐ نے وہ اسلامی نظام قائم فرمایا جس میں لوگوں کے معاملات کے قیصلے کتاب اللہ کے مطابق کئے جاتے تھے کیونکہ حضورؐ سے کہا گیا تھا: فَاتَّخِذُوا مِنْ دُونِي مِثْلًا مِمَّا آتَاَنِ اللَّهُ (۱۱)۔ حضورؐ خود اسی کتاب پر ایمان لائے تھے (۱۲) اور اسی کا اتباع کرتے تھے۔ (۱۳) اس کتاب عظیم کی خود اللہ تعالیٰ نے اس قدر خصوصیات بیان کی ہیں کہ اس خطاب میں ان کا حصر ناممکن ہے۔ ان میں سے چند ایک کے عنوان اس قدر پیش خدمت ہیں :-

## فُتْرَان کی خصوصیات

- (۱) وحی خداوندی تمام کی تمام قرآن کے اندر محصور ہے اور یہی حضورؐ کے مخی طبع میں آنے والوں کے لئے ضابطہ ہدایت تھی اور ہے۔ (۱۴) یہ ناممکن تھا کہ اس کا کوئی ایک لفظ بھی چھوٹ گیا ہو (۱۵)۔
- (۲) چونکہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی اس لئے ساری دنیا کو چیلنج دے دیا گیا تھا کہ اس کی مثل ضابطہ حیات مرتب کر کے دکھاؤ (۱۶)۔
- (۳) یہ اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے اس لئے اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ (۱۷) (۱۸)۔
- (۴) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۱۹) اس لئے جو لوگ اسے ضابطہ حیات تسلیم کریں گے ان میں بھی نہ باہمی اختلاف ہوگا نہ تفرق۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۲۰)۔
- (۵) یہ ہر اعتبار سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ سورۃ الانعام میں ہے: وَكَهَاتُكَ كَلِمَاتُهَا لَا يَمْلِكُ الْبَاطِلُ اَنْ يَكْلَمَ بِهَا (۲۱)۔ جنہ قوانین خداوندی اس کتاب میں مکمل طور پر دے دیئے گئے ہیں۔ ان میں نہ حک و اعاقہ کیا جاسکتا ہے نہ تغیر و تبدل۔ اور تو اور خود رسول اللہ کو بھی اس کا اختیار نہیں تھا کہ اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر سکتے۔ سورۃ یونس میں ہے کہ حضورؐ کی دعوت کے مخالفین آپ سے کہتے کہ ہم آپ سے معاہدہ کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ آپ اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لے آئیں یا کم از کم اس میں کچھ تبدیلی کر دیں۔ اس کے جواب میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا: قُلْ مَا يَكُونُ لِي اَنْ اُصْبِحَ لَهُ مِنْ تِلْكَ آيَةٍ نَقُصِّيْهِ لَئِنْ رَاْتُمْ مِنْ اٰيَاتٍ مِنْ اٰتِئَاتٍ مِنْكُمْ لَتَقُولُنَّ سِحْرٌ غَائِبٌ اِذٍ اُنْزِلَتْ اِلَيْهِ (۲۲)۔ جب یہ کتاب میری تصنیف ہی نہیں تو میں تبدیلی کس طرح کر سکتا ہوں؟ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مَائِيْكُوْحٰی اِلٰی۔ میں تو خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ اِنِّیْ اَخَذْتُ مِنْ عَصَايَ مِنْ اَنْفِیْ عِظْمٍ مِنْ عِظْمِ (۲۳)۔ اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔
- (۶) اس کتاب کو مکمل اور غیر متبدل قرار دینے کے بعد اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ (۲۴) اور تمام نوع انسان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب تمہاری رہنمائی کے لئے کافی ہے (۲۵)۔ اس کی موجودگی میں تمہیں کسی اور راہنمائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔
- (۷) اور اس کے بعد واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کفر اور اسلام میں یہی مابہ الامتیاز ہے۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (یہ)

جو لوگ اس کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کریں گے تو انہیں کافر کہا جائے گا۔

یہ ہے وہ کتابِ مطہر جس کے متن اقبالؒ جہودِ قوم کو کہتا ہے :

تو ہی دانی کہ آئین تو چیست ؟	زیر گردوں ، سر تکین تو چیست ؟
آن کتابِ زندہ ، قرآنِ حکیم	حکمتِ ادایزال است و قدیم
نسخہٴ اسرارِ تکوینِ حیات	بے ثبات از قوتِ غیرِ ثبات
حرفِ ادریب نے ، تبدیل نے	آید اش شرمندہٴ تاویل نے
پختہ تر سواد کے خام از دورِ اد	دقتِ با سنگِ جام ، از دورِ اد
تو یہ انسان را پیامِ آخبریں	حاصل او رحمتہ اللعالمین (اسرار و مودت)

بات یہاں سے چلی تھی کہ ان کے تمام نفسیاتی امراض کی جڑ اور بنیادِ جوت ہے خوفِ اللہ کی نگرانی سے پیدا ہونا۔ خواہ وہ سیاسی حکومت کی شکل میں رہو اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے پیکی میں۔ قرآنِ مجید ان کی حکومت کے تصور کو ختم کر کے خوف اور حزن کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ یہ مقام اس وقت حاصل ہوگا جب انسان خدا کی کتاب کی ایسی حکومت اختیار کرے جس میں اللہ کی حکمت اور جذبات کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس پورے پروگرام کو قرآن مجید نے ایک آیت میں شہادتِ جامعیت سے صاف بیان کر دیا جب کہا :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَالْكِتَابِ وَالْحُكْمِ وَالشُّرُوعِ لَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أَمْرَهُ وَطَعْنُوا دُونَهُ الْكِتَابِ وَبِمَا كُتِبَ فِيهِ سُلُوكٌ

(یہ)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اس کی حیثیت مقتدر کی ہو یا انتظامیہ کی حتیٰ کہ اسے نبوت کا منصب بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے ہی کہنا چاہیے کہ آؤ ہم اہم سب مل کر خدا کی کتاب کے اتباع سے اللہ کے محکوم بن جائیں۔

امی کو توحید کہا جاتا ہے جو اسلام یعنی نظامِ خداوندی کی اصل اور بنیاد ہے۔ توحید کا عملی مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی ہر انسانی حکومت سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی کتاب کی حکومت اختیار کی جائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کرے تو اس کا لازمی نتیجہ مساوات ، محکمیت اور آزادی ہوگا۔ اسلام جس انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبنیہ الوہیاتی اقتدار کو۔ (انگریزی خطبات صفحہ ۱)

وہ روزِ بے خودی میں توحید کے متعلق کہتے ہیں :-

دینِ ازاد ، حکمتِ ازاد ، آئیں ازاد	زورِ ازاد ، قوتِ ازاد ، تمکینِ ازاد
تدوینِ ادبِ برگزینہ ہندہ را	توہینِ دیگر آئندہ ہندہ را
بیم و شک میر و عملِ گیر و حیات	چشمِ می بیند ضمیر کا منات
چوں مقامِ عسیدہٴ محکم مشور	کاسہٴ در یوزہٴ جامِ جسمِ شہور



کتاب اللہ کی حکومت میں خوف اور حزن کس طرح کا فوہو جاتا ہے، ہمارے صدر اول کی مجموعہ تاریخ اس کی مثالوں سے عانتاب ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا جو واقعاتی لحاظ سے تو معمولی سی ہیں لیکن ہمارے مقصد پر پیش نظر کے اعتبار سے بڑی اہم ہیں۔ مدینہ میں برسہو نامی ایک لونڈی تھی جس نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے خاوند کی درخواست پر حضورؐ نے اس سے کہا کہ وہ اپنے خاوند کو نہ چھوڑے، آپ سوچیے کہ یہ کہنے والا کون ہے اور جس سے کہا جا رہا ہے وہ (ہمارے مروجہ تہذیب اور معیار کے مطابق) کس حیثیت کی مالک ہے؟ کہنے والا سربراہ مملکت بھی ہے اور خدا کا رسول بھی، اور جس سے کہا جا رہا ہے وہ اس کی رعیت بھی ہے اور اس پر ایمان لانے والی بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی سفارش کے جواب میں اس نے کیا کہا؟ اس نے پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ہے جسے آپ مجھ تک پہنچا رہے ہیں یا آپ کی اپنی سفارش؟ آپ نے فرمایا کہ یہ خدا کی وحی نہیں۔ میرا قافی مشورہ ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ پھر معاف فرمائیے، میں آپ کا مشورہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں۔ ایسا کہنے سے تو اس کے دل میں ایک سربراہ مملکت کی حکم عدلی سے کوئی خوف پیدا ہوا، اور نہ ہی خدا کے رسول کی معصیت کے احساس سے کس قسم کا حزن۔

دوسری مثال اس واقعہ کی ہے جس کی رو سے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں یہ چاہا کہ قہر کی کوئی انتہائی حد مقرر کر دی جائے۔ جب انہوں نے اپنی اس تجویز کو مجمع کے سامنے پیش کیا تو ایک بڑھیا نے اٹھ کر کہا کہ عمرؓ خدا کا خوف کرو۔ خدا کا ارشاد تو یہ ہے کہ تم چاہو تو قہر میں سونے کا ڈھیر بھی دے سکتے ہو۔ تمہیں خدا کے اس حکم پر حزن کا اختیار کیسے حاصل ہو گیا؟ یہ سن کر سربراہ مملکت نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور معذرت سے کہا کہ مجھے یہ مانجھے مفت نہ لکھنا۔ قرآن کا یہ ارشاد میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ بھی وہ جڑائیں اور میڈیا کیوں جوانوں کے دل میں توحید سے پیدا ہوتی ہیں۔



ان کے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ واضح ہے قرآن کریم نے نظام خداوندی کا منتہی یہ بتایا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا هُمْ يَخْشَوْنَ۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہو گا۔ لیکن قرآن مجید میں خدا کے خوف کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ خوف کے معنی کسی آنے والے خطرے کے احساس سے اس سے بچنا یا رہنے کے بھی ہیں۔ مثلاً یہ ڈر کہ اگر میں نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تو اس سے ہاتھ جل جائے گا اور مجھے بڑی تکلیف ہوگی اس لئے مجھے آگ کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے خوف سے یہی مراد ہے۔ یعنی اگر میں نے ان کی خلافت ورزی کی تو اس سے مجھے بڑا نقصان پہنچے گا۔ اس لئے مجھے بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ یہ احتیاط ہر قسم کے خوف سے محفوظ اور مأمون کر دیتی ہے۔ اقبالؒ نے خوف یا حزن کے ان سرد وراثت میں بڑا نازک سا فرق بتایا ہے جب کہا ہے :-

بیک غم است آن غم کہ آدم را خورد / آن غم دیگر کہ ہر غم را خورد (ادب و عجم ص ۲۵۴)

یعنی ایک غم وہ ہے جو ان کو کھا جاتا ہے (یہ ان کی حکومت کا خوف اور مذہبی پیشوائیت کا حزن ہے) اور دوسرا غم وہ ہے جو ہر غم کے غم کو کھا جاتا ہے (یعنی احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنا۔ اسے قدرتی کہتے ہیں) اس فرق کو



حفیظ ہوشیار پوری (مرحوم) نے غزل کے انداز میں پٹری و لکشی سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ  
 زمانے بھر کے غم، یا ایک تسخیر غم، یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے!  
 اور اقبال کے الفاظ میں

یہ ایک سجدہ ہے تو گراں سمجھتا ہے نہرا سجدے سے دیتا ہے آدمی کو بچتا

خدا نے اپنی طرف نہیں بھی جھنکا لفظ منسوب نہیں کیا۔ خوف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، خوف،  
 قانون خداوندی کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والے نقصان کے احساس کا نام ہے۔ خدا نے اپنے ہر قانون کے سلسلہ  
 میں وضاحت کر دی ہے کہ اس نے ایسا قانون کیوں بنایا ہے۔ یعنی اس کی توجیہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس کے برعکس،  
 جن 'لا قانونیت کی طرف سے پیچھے والی اذیت کے احساس کو کہا جاتا ہے جس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور قانون  
 خداوندی کے برعکس، انسانوں کا وضع یا قذکرہ ہر قانون عدالت خداوندی میں لا قانونیت کے درجے میں آتا ہے۔



قرآن مجید کی اس پولیٹیشن کے تعین کے بعد آپ غور کیجئے کہ یہ نوع انسان کے لئے کس قدر حشر و عذاب بن جاتا ہے!  
 آپ ایک قوم سے کہتے ہیں کہ اس کتاب کو دیکھئے۔ یہ ہمارے لئے آئین حیات اور ضابطہ قوانین ہے۔ آپ اسے دیکھئے  
 اور اچھی طرح پرکھئے۔ اگر آپ اس سے مطمئن ہوں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ وہ قوم آپ سے کہتی ہے کہ ہمارا اس  
 پر اطمینان تو ضرور ہے لیکن حکومتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل کو کوئی اور حکومت آجائے اور  
 وہ اس میں رد و بدل کر دے۔ آپ اس سے کہتے ہیں اس میں یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی شخص کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر  
 سکتا۔ اس پر وہ کہتی ہے کہ یہ مانا کہ اس میں کوئی حکومت تبدیلی نہیں کرے گی لیکن کل کو کوئی نئی آجائے تو وہ تو اس  
 میں تبدیلی تو ایک طرف اس کی جگہ کوئی دوسرا ضابطہ قوانین لاسکتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب وہ ہے جس نے مذہب  
 کی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ نبوت ختم کر دیا ہے اس لئے اب  
 کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا۔ لہذا یہ قرآن تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک کے لئے غیر متبدل  
**ختم نبوت** اور احسنی ضابطہ قوانین رہے گا۔

ختم نبوت کا اعلان فی الواقعہ ایک عظیم انقلاب کا اعلامیہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:-  
 اسلام کا ظہور استقرائی فکر (INDUCTIVE INTELLECT) کا ظہور ہے۔ اس میں نبوت اپنی تکمیل کو  
 پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف  
 نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہد طفولیت کی ڈوریوں سے باندھ رکھا جاسکتا۔  
 انسان کو شعور و خویش کی منزل تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اس کی اپنی صلاحیتوں کے سہارا  
 پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن مجید غور و فکر  
 اور تجربات و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسان کے ذرائع ٹھہراتا  
 ہے یہ سب ختم نبوت کے نظریہ ہی کے مختلف گوشے ہیں۔ . . . . عقیدہ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت  
 یہ بھی ہے کہ اب نوع انسان کی تاریخ میں کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی فوق الفطرت انتہائی

کی بناء پر دوسرے کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نظریاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوے کے خاتمہ کو دیتی ہے۔ (پانچواں خطبہ، ص ۱۲)

وہ اپنے چھٹے خطبے کے خاتمے پر کہتے ہیں :-

اس عقیدہ کی حامل قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ آزلو قوم ہونا چاہیے۔ (ص ۱۱)

عقیدہ ختم نبوت کی محکیت قرآن کے اس اعجاز پر ہے کہ اس کے اصول و اقدار میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانے کے بدلنے والے انسانی تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

چل مسلماناں اگر داری جب گھر در ضمیر خویش در دست آن نگر  
صد جہان تازہ در آیاتِ اوست عصر با چیمید در آفاتِ اوست  
یک جہانش عصر حاضر ایں است گیر اگر در سبزل دل معنی رس است  
بنده مومن ز آیاتِ خداست ہر جہاں اند ہر ادر چلہ تباست

چل کہن گر دو جہانے در بر کش

نی وہ دستہ آں جہانے بگر کش (جاوید نامہ، ص ۴۲)

ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس کتاب کا وارث قرار دیا (۳۱) اور ان سے کہا کہ جو اصول اور اقدار اس میں دیئے گئے ہیں ان پر عمل درآمد کے طور پر طریق اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود طے کر لیا کرو (۳۲)۔ یہی حکم خود رسول اللہ کو بھی دیا گیا تھا (۳۳)۔ یہ اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر تبدیل رہیں گے لیکن ان پر عمل درآمد کے طور پر طریق، جو باہمی مشاورت سے طے پائیں، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے جائیں گے۔ اس طرح ثبات اور تغیر کے اس امتزاج سے حکومت خداوندی ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی۔

**اس کے بعد کیا ہوا ؟** اسلام کے صدر اقل میں یہ حکومت اسی طرح قائم ہوئی تھی اس کے بعد کیا ہوا اسے آئیے؟

نقش قرآن تادری عالم نشست نقشہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ، ص ۹)

اس کے بعد اس قوم نے کیا کیا ؟

خود طلبیم قیصر و کسریٰ شکست خود میر تخت ملوکیت نشست  
شمال سلطنت قوت گرفت دین او نقش از ملوکیت گرفت  
از ملوکیت ننگ گدرد دگر

عقل و ہوش و رسم و رواج گرد دگر (جاوید نامہ، ص ۱۱)

یعنی سب سے پہلے ہم نے ولایتی بادشاہت کو قائم کر لیا۔ ہماری تاریخ کی یہ بوالعجبی جہاں انتہائی حزن انگیز ہے وہاں اتنی ہی بڑی جبریت نروسش بھی ہے۔ برید کے خلاف انتہائی سنگین جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے ولایتی بادشاہت کی طرح ڈال کر اسلام کی حریم کاٹ کر رکھ دی۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر عجیب و غریب ہے کہ برید کے بعد ہماری تاریخ میں

تمام بادشاہتیں اسی طرح قائم ہوئیں جس طرح یزید کی بادشاہت کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اس میں ناقابل فہم اور انتہائی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جہند بھی پیشوا بہت زیادہ کے خلاف بیچرم عائد کرتی ہے، وہ اس کے بعد کسی انداز سے برسرِ اقتدار آنے والے بادشاہوں کے نام خطبوں میں پکارتی اور ان کے حق میں تائید و نصرتِ خداوندی کی دعائیں مانگتی چلی آ رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ فخریہ دعوے کیا جاتے ہیں کہ اس تمام دوران میں اسلام اپنی تائیدیوں کے ساتھ مسلسل آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے؟ سوچئے کہ کیا اسلام اور موروثی بادشاہتیں کبھی یکجا رہ سکتی ہیں؟

آپ کو شاید اس پر حیرت ہو کہ خدا کی حکمرانی کے متعلق قرآن کریم کے ایسے واضح ارشادات کی موجودگی میں الہی بادشاہت کو کیسے رد رکھا گیا؟ ہم نے دیکھا ہے کہ حکومتِ خداوندی کی بنیاد لایٰ اللہ الا اللہ پر تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا کے متوازی حکومتیں | سو کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ انہوں نے آلہ کا ترجمہ معبود کیا اور معبود کے معنی بتائے جس کی پرستش کی جائے اس کے ساتھ ہی عبادت کے معنی بھی پرستش کر دیئے۔ لہذا، لا الہ الا اللہ کے معنی ہو گئے "خدا کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی پرستش کی جائے" اور آیاتِ تعید کے معنی یہ کہ ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں۔ یعنی پرستشِ خدا کی اور حکومتِ بادشاہوں کی! اور ان بادشاہوں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ "السلطان ظل اللہ علی الارض" "بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے" بادشاہوں نے اس کے معاوضہ میں یہ سمجھ کر لیا کہ دنیاوی امور کے متعلق تو ہماری حکومت ہوگی اور امورِ شریعت کے متعلق مذہبی پیشواؤں کے احکام نافذ ہوں گے۔ لیکن ایک مملکت میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں اور امتِ حقیقی کے ان دو پالوں میں پستی چلی گئی اور ان کا قلبِ دعوت و حزن کا ماس بنتا چلا گیا۔ اس کے بعد آپ تحقیقاتی کمیشن پٹھاتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قوم میں اس قدر اخلاقی زمام کیوں پیدا ہو گئے ہیں؟ صدیوں کے اس خوف و حزن کا نتیجہ اخلاقی زمام نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوگا؟

۵

یہ تو باریک بینی سے حکومتوں کا تقاضا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہب کی دنیا میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی؟ یہ وہ مقام ہے جہاں پاؤں رکھتے ہوئے دھارے کی زبان میں فرشتوں کے بھی پڑ جاتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی کیفیت یہ ہے کہ ان سے متعلق کسی معاملہ پر تنقید کیجئے تو اس پر غور و غفلت سے دل سے غور کرنا تو دیکھنا وہ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ اس پر کوئی بھی غور و فکر کی جرات نہ کر سکے۔ وہ اپنے شورا نگین ریپریگنٹ سے عوام کو اس طرح مشتعل کر دیتے ہیں کہ غور و فکر کی تمام گنجائشیں سل کر رہ جاتی ہیں۔ میں آپ سے خصوصیت سے درخواست کروں گا کہ جو کچھ میں اب پیش خدمت کر رہے ہوں آپ اس پر غور و غفلت سے دل سے غور فرمائیے میں شروع ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کے عقیدے کو زیرِ بحث نہیں لاؤں گا۔ صرف واقعات تک محدود ہوں گا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ وحیِ خداوندی یہ تمام دیکھ کر قرآن مجید کے اندر جمع ہو گئی۔ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا اور اس طرح دین کی کیمبل ہو گئی۔ لیکن بعد میں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحیِ خداوندی تمام قرآن مجید میں درج نہیں ہوئی۔ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک قسم کی وحی قرآن مجید میں درج ہوئی۔ دوسری قسم کی وحی احادیث میں۔ یہ دونوں قسم کی وحی قرآن ہی میں کیوں نہ جمع کر دی گئیں اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا یا ریٹائیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔ (تفہیمات - جلد اول - ص ۲۳)

## احادیث کے مجموعے

وکی کا یہ حقتہ اُمت تک کس طرح پہنچا یہ بات غور طلب ہے۔ اس مجموعے کو مرتب کر کے نہ تو رسول اللہ نے اُمت کو دیا اور نہ ہی صحابہ کیا کرنے ایسا کیا۔ غریب دو سو سال بعد ایمان کے کچھ ارباب تجسس و تحقیق اسٹھے اور لوگ جن زبانی روایات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر لے تھے انہیں ان سے سن کر جمع کرنا شروع کیا۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں تھیں۔ انہوں نے ان میں سے چند ہزار کو قابل قبول قرار دیا اور باقی لاکھوں روایات کو مسترد کر دیا۔ مثلاً امام بخاریؒ نے چھ لاکھ روایات میں سے اسکو رات کو نکال کر صرف دو ہزار سات سو بائیس روایات کو قابل قبول قرار دیا۔ اسی طرح امام مسلمؒ نے تیرہ لاکھ روایات میں سے ایک سو تیس روایات کو قابل قبول قرار دیا۔ البوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی نے بھی لاکھوں کے ذخیرے میں سے چند ہزار روایات کو قابل قبول قرار دے کر اپنے اپنے مجموعے تیار کئے۔ سنیوں کے ہاں ان بچے مجموعوں کو احادیث کی صحیح ترین کتابیں تسلیم کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان جامعین حدیث کے پاس وہ کون سا ذریعہ اور کون سی اتھارٹی تھی جس کی بناء پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ روایات ٹھیک ٹھیک رسول اللہؐ کی ہیں اور یہ واقعی اس لئے مسترد کر دینے کے قابل یا غایر ہے کہ انہیں تو اس کا علم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور نہ ہی ان کے تجربوں کی تصدیق رسول اللہؐ نے فرمائی۔ وہ ان تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ ہر حال اپنے خیال کے مطابق کیا تھا۔

جب احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جن راویوں کا ذکر احادیث میں آتا ہے ان کے متعلق تحقیق کیا جانا چاہیے کہ وہ قابل اعتماد تھے یا نہیں۔ اسے املاء الرجال کا فن کہا جاتا ہے۔ اس فن کے ماہرین نے دو سو سال پہلے کے گز سے ہوئے ان لوگوں کے متعلق تحقیق کرنا شروع کیا کہ وہ کس حد تک قابل اعتماد تھے۔ اس قسم کی تحقیق کے بعد احادیث کے مختلف مدارج مقرر کئے گئے۔ صحیح، حسن، ضعیف، مرفوع، موقوف، وغیرہ ہزار برس سے یہ مجموعے اسی طرح چلے آ رہے تھے کہ ہمارے زمانے میں ایک صاحب نے یہ دعوے کیا کہ احادیث کے پیچھے کے یہ طریق اور ذرائع قابل اعتماد نہیں۔ اس کے لئے ایک اور ذریعہ ہے جس کی روش سے حتم و یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کون سی حدیث رسول اللہؐ کی ہے اور کون سی ایسی نہیں۔ وہ ذریعہ یہ ہے کہ

## مزاج شناس رسولؐ

جن شخص کو اللہ تعالیٰ توفیق کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پُرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جو اس کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پہچان لیتی ہے۔ اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے متاثر ہو سکتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ وہ شخص نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ اس میں سے کون سا قول یا کوئی فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبیؐ کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ ارشادِ باری ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا جسے انہوں نے اپنی کتاب تفسیرات جلد اول (صفحہ ۳۳۳) پر تحریر فرمایا ہے۔ اس معیار کی روش سے آپ کو مزاج شناس رسولؐ کی نگہ بصیرت پر ایمان لانا ہوگا یعنی یہ ماننا پڑے گا کہ جس بات کے



متعلق وہ کہہ دے کہ وہ ارشادِ نبوی ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے۔  
یہ ہے ان احادیث کی تاریخ لیکن ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے :-

تحقیق و تحقیق کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عظیم کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عظیم کے انکار کا .... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور آئمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مترادف۔  
(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۱۴۱ مولانا محمد اسماعیل رحیم سابق صدر جمعیت اہل حق)

”کفر اور ملت سے خروج“ کے الفاظ سے آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیے جس شخص پر کفر اور ملت سے خروج کا فتویٰ عام ہو گیا دیا جائے اسے مرتد قرار دے دیا جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان احادیث میں سے کسی ایک حدیث کے انکار کا عملی نتیجہ کیا ہوگا؟ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے میں اس وقت عقائد سے بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں بخاری شریف سے دو ایک ایسی حدیثیں پیش کرنے کی اجازت چاہ رہا ہوں گا جن کا تعلق معلومات عامہ سے ہے۔ ایک حدیث ہے :-

**بخاری کی احادیث** | نبی نے بغداد سے جب کہ آفتاب طلوع ہوا تھا، یہ فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کہا جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب واقف ہے۔ آپ نے فرمایا

کہ وہ جانا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے۔ پھر اللہ سے اجازت طلوع کی مانگے گا تو اسے اجازت طلوع کی دی جائے گی۔ اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت مانگے اور اسے اجازت نہ ملے۔ اس سے کہہ دیا جائے کہ جہاں سے تو آیا ہے وہیں لوٹ جا۔ پس وہ مغرب سے طلوع کرے گا۔  
(بخاری اردو ترجمہ جلد دوم - ص ۱۳۲)

بخاری شریف ہی کی ایک دوسری حدیث ہے کہ

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ دو رخت نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک جھٹلے میرے دوسرے جھٹلے کو کھالیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں اور ایک سانس گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو یہ بھی جہنم کا سانس ہے۔ (بخاری اردو ترجمہ جلد دوم - ص ۱۳۲)

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سورج کا طلوع و غروب اور موسموں کا تغیر و تبدل زمین کی گردش کی وجہ سے ہوتا ہے تو اس سے ان احادیث کا انکار لازم آئے گا۔ اس انکار کا نتیجہ کفر اور ملت سے خروج ہوگا جس کا نتیجہ ارتداد اور ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اس سے آپ خوفِ ارتداد کا اندازہ لگا لیجئے۔

جہاں تک احکامِ شریعت کا تعلق ہے، عقیدہ یہ ہے کہ احادیث میں جو احکام درج ہیں وہی اسلامی احکام ہیں۔ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اگر کوئی حدیث ایسی ہو جو قرآن کے کسی حکم کے خلاف ہو تو حکمِ حدیث کا نافذ ہوگا قرآن کا نہیں کیونکہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ (فقہ انکار حدیث از علامہ حافظ محمد ابوبکر رحیم ص ۱۳۲)

حدیث سے آگے بڑھ کر فقہ کی طرف آئیے۔ بعض قانون دان حضرات نے یہ کہا کہ قرآن تو ایک طرف جو احکام احادیث

میں بھی دستِ چپ وہ بھی رہانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے خود قوانین وضع کئے اور کہا کہ قرآن اور حدیث کے تمام احکام ان قوانین کے اندر آ گئے ہیں۔ اور یہ اسلام کے لئے کافی ہیں۔ انہیں ائمہ فقہ کہتے ہیں جن میں سے چار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ۔

ان فقہی قوانین کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان میں ایسے قوانین بھی ہیں جو قرآن کے بھی خلاف ہیں اور بعض احادیث کے بھی خلاف۔ اس سلسلے میں عقیدہ یہ ہے کہ حکم بہر حال فقہ کے قوانین کا نافذ ہوگا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مسمم امام ابوالحسن عبید اللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مستول ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہر وہ بھی مستول یا منسوخ ہے۔

(تاریخ فقہ اسلامی - شائع کردہ دار المعنفین اعظم گڑھ ص ۲۲)

ہمارے ہاں حال ہی میں جو چند قوانین ”شرعی حدود“ کے نام سے نافذ کئے گئے ہیں ان کا تعلق فقہ حنفی سے ہے۔ مطالبہ بیکیا جاتا ہے کہ یہاں پوری کی پوری فقہ حنفی کو پبلک لاء کے طور پر نافذ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ شیعہ حضرات کے احادیث کے ٹیوٹے بھی الگ ہیں اور ان کی فقہ بھی الگ۔ وہ فقہ حنفی کو تسلیم نہیں کرتے۔ سینوں میں اہل حدیث بھی فقہ حنفی کو تسلیم نہیں کرتے۔ دیوبندی اور بریلوی دلول حنفی ہیں لیکن ان کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں چمکتے۔

فقہ کے یہ احکام ان تلوں کے مرتب کردہ ہیں لیکن جب یہ نافذ ہوئے تو مودودی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ اب ہمارا سرعہ یہ ہے کہ

عوام ان کو یاد دلائی کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۵ء ص ۳۱

آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت کس طرح اپنے فیصلوں کو خدا کے قوانین کہہ کر نافذ کرتی ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے دوسرے مقام پر کہا کہ

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرتا اور چیرتا ہے اور خدا تعالیٰ اور رسول کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

(ایشیا سوڈن الرشدی مشہور ص ۹)

دنیاوی سراجی اور خدا کا غضب بھی! آپ نے خوف اور حزن کی شدت کا اندازہ لگایا؟

یہ ہے وہ مقام جس پر امت آج کھڑی ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ وہ صدیوں سے اسی راستے پر گامزن ہے قرآن نے کہا تھا کہ حکومت صرف خدا کی سوا کسی کی تعبیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ سیاسی حکومت ہو یا مذہبی پیشوائیت ان میں قرآن کریم کا کوئی عمل اور دخل نہیں۔ سب ان لوگوں کے مرتب کردہ قوانین ہیں اور وہ بھی ہر بار برس پہلے کے۔ ان لوگوں کے ان وضع کردہ احکام شریعت سے خوف اور حزن کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ ایک شخص غصے

کی حالت میں اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہے طلاق، طلاق، طلاق، تھوڑی دیر کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے تو وہ بیوی صاحب کے پاس فتویٰ لینے کے لئے جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تمہارا نکاح ٹوٹ چکا ہے۔ اب اس کا حل اس کے سوا کوئی نہیں کہ تمہاری بیوی کسی دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ رات بسر کرے۔ پھر وہ اسے طلاق دے دے تو تمہارے ساتھ اس کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اس فتویٰ سے اس خاوند پر جو طلاق، طلاق، طلاق گزرتی ہے اسے تو پھوڑیئے۔ اس بے گناہ بیوی کی کیفیت کو سامنے لائیے۔ میرے پاس اس قسم کے میاں بیوی اکثر آتے رہتے ہیں۔ وہ عصمت مآب خاتون پانچ چھ بچوں کی ماں ہے۔ سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اداس فتنے کے تصور سے اس پر غش کے ددرے پڑ رہے ہیں۔

بیوی پر طلاق پڑنے کی صورت یہی نہیں کہ خاوند طلاق، طلاق، طلاق کہہ دے۔ ان حضرات کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کے خلاف یہ کفر کا فتویٰ صادر کر دیں اس کی بیوی پر اخذ طلاق پڑ جاتی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ تمام مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کوئی فرقہ ایسا نہیں جس پر کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ اس معیار کی رو سے دیکھیے تو دنیا میں کوئی مسلمان ایسا نہیں رہتا جس کی بیوی پر طلاق نہ پڑ چکی ہو۔ یہ بات فرقوں تک محدود نہیں۔ مشاہیر امت میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ مثلاً قائد اعظم محمد علی چندی کو لیجے۔ غس احقر کے مولانا مظہر علی اظہار دہلوی کے مولانا حسین احمد مدنی نے انہیں کافر اعظم کے فتویٰ سے نوازا۔ یہ بیوی فرقہ نے تفصیلی فتویٰ صادر فرمایا جس میں کہا :-

بحکم شریعت مسٹر جیٹا اپنے ان عقائد کفریہ، قطعید، جنتیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک نہ کرے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر و مرتد اور شرک الا نام اور بے توہمہ و مستحق لعنت عزیر العالم ہے۔

(تجانب اہل السنہ ص ۱۲۷)

یہ تو بڑا قائد اعظم کا (معاذ اللہ) کافر اور مرتد ہونا۔ اس کے بعد دوسرے فتویٰ میں کہا گیا کہ جو شخص قائم اعظم کو کافر اور مرتد نہ سمجھے اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی۔ ۱۔ فتویٰ مبارکہ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند لاہور ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مذہبی پیشوائیت کی جسکرائی کا کیا عالم ہے اور اس کے تابع امت کس قسم کے جگر سوز خوف اور حزن کا شکار چلی آ رہی ہے۔ ان کے اس قسم کے فتوے احکام خداوندی کے یکسر خلاف ہیں۔ آپ سوچئے کہ جو قوم اتنی صدیوں سے ایک طرف مودنی پادشاہوں کے پیچھے استبداد میں جھک رہی چلی آ رہی ہو اور دوسری طرف اس قسم کے احکام شریعت کی پابندیوں میں محصور اس کی قلبی اور ذہنی کیفیت کس قسم کی ہوگی اور وہ کون سا نفسیاتی مرض ہوگا جس کا وہ شکار نہ ہوگی؟ اقبالؒ نے امت کے اس بلیادی مرض کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: رہ چوں خلافت رشتہ از قرآن گنجست حریت را ز ہر اند کام ریخت (اسرار و رموز ص ۱۲)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و متین کس بسنن نطق! مومن و غمداری و فقر و نفاق!  
پیشینے دین و ملت را فروخت ہم شایع خانہ و ہم خانہ سوخت

ہماری نسلوں حالی



لا الہ اندر نماز کشتن بود نہ نیست  
نور در صوم و صلوات او تماند  
روح چوں رفت از صلوات از صیام  
سینہ با از گزشتی ستر کشتی  
ہر کسے پر جادہ خود تندر د  
نادر مابے نام در سدرہ دد (چاودہ نامہ صفحہ ۲۳۴)

سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ قرآن کریم نے اپنے آپ کو "شفاعا لما فی الصدور" کہا ہے۔ لہذا اگر ہمارا اس پر ایمان ہے تو یہی ہمارے لئے نسخہ شفا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحسوس دل کی  
علاج اس کا وہی آپ نشاط انگیز ہے ساقی (ہال جبریل)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں :-

حر تو متخواہی مسلمان لیستن تیسست ممکن جسہ بقرآن زیستین

"جو بقرآن کے معنی والا اللہ کے ہیں۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے الا اللہ تک پہنچنے سے پہلے لا الہ الا اللہ کا ایفک ہے۔ یعنی ان لوگوں کے وضع کردہ تمام آئین و مساویہ و قوانین و احکام سے قطع نظر خالص کتاب اللہ کی عکسیت۔ آپ دیکھئے کہ اس کا علاج قرآن کریم میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حشر کا میدان ہے۔ تمام قومیں ایک ایک کر کے اپنے اپنے رسول کے زیر شہادت یا رگاہ خداوندی کے سامنے سے گزر رہی ہیں جب ہماری

باری آتی ہے تو حضور نبی اکرمؐ پکار کر کہتے ہیں۔ یا سرت ان قومی الخدا فوالہذا ان القرآن (پیش) "اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس سے قرآن کو چھوڑ دیا تھا" دیکھئے! رسول اللہؐ یہیں فرماتے کہ میری امت نے بخدا اور مسلم کو چھوڑ دیا تھا یا ہایہ اور دلالتا (فقہ کی کتابوں) کو۔ وہ فرماتے ہیں تو یہ کہ اس قوم نے قرآن کو ترک کر دیا تھا حضورؐ نے اپنی امت کو قرآن ہی سے متمسک رہنے کی تاکید فرمائی تھی اور آپ قرآن ہی کو ترک کرنے والوں کے خلاف الزام عائد کریں گے اس لئے امت کے املاق کے ازالے کی صورت قرآن ہی سے متمسک ہونے میں ہے۔ تمسک بالقرآن کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے ہاں فقہ اور حدیث کا جو ذخیرہ چلا آ رہا ہے (معتبر ضمیم کے الفاظ میں) اسے دریا برد کر دیا جائے مقصد یہ ہے کہ دین میں سدا در رحمت خدا کی کتاب کو تسلیم کیا جائے اور اسی کو قیض اور صحیح کا معیار قرار دیا جائے۔ اس کے غیر متبادل قوانین و اقدام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود مرتب کئے جائیں اور ایسا کرنے میں اسل تمام لشکر پھر سے مدد ملی جائے جو ہمارے ہاں متواتر چلا آ رہا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ

سے رہنمائی لے سکے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔ (چٹا خطہ صفحہ ۲)

شرعیات کے معنی ہمارے ہاں شریعت کا لفظ تو سہرا ایکہ کی زبان پر ہوتا ہے لیکن اس کے معانی پر کبھی غور نہیں کیا جاتا۔ عربی زبان میں شریعت اس راستے کو کہتے ہیں جو پانی کے گھاٹ کی طرف لے جائے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ پانی پہنچنے والا (آپ رسالت) ہو۔ ایک مقام پر عظمیٰ ہوا (جو پھر بالآب) نہ ہو۔ اگر پانی ساکن ہے تو عرب اس راستے کو شرط نہیں کہیں گے، لہذا جو طریق عمل جامد ہو کر رہ جائے اور زمانے کے بدلنے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے اسے "شرعیات" کی راہ کہا ہی نہیں جائے گا۔



ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کی مد سے کسی انسان یا انسانوں کے گرد کو حق حکومت حاصل ہی نہیں حق حکومت صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے اور چونکہ اس کتاب میں کسی انسان کا عمل دخل نہیں اس لئے اس کی حکومت اختیار کرنے میں انسان ہر قسم کے خوف اور حزن سے آزاد اور مامون ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مَوْنٌ وَخَلْدٌ کَانَ آمِنًا (پہلا جو اس نظام حکومت میں داخل ہو گیا اسے ہر قسم کا امن نصیب ہو جائے گا۔



زیر نظر موضوع کو اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے لیکن آخر میں میں ایک اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو تہذیب گریہ و نوحہ انوں کی طرف سے اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے آخری دین یا ناکہ دنیا سے ظلم اور استحقاق کا خاتمہ ہوا ورنہ ان انسان و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ ظلم بھی اسی طرح سے ہماری ہے اور استحقاق بھی مظلوم آج بھی اسی طرح پس رہے ہیں اور کسی کو اطمینان نصیب نہیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر اس دین کا فائدہ کیا ہوا اور اسلام نے اگر کیا کیا اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کے ذہن میں تصور یہ ہوتا ہے کہ اسلام کسی شخص کا نام ہے جسے خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ظلم و ستم کو مٹا کر، عدل و انصاف رائج کر دے۔

## ایک اعتراض کا جواب

اسلام کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں۔ جیسا کہ میں نے اس خطاب کے آغاز میں کہا ہے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم ایک نسخہ خطا کر رہے ہیں جس کے استعمال سے انسانیت کے امراض و مشغلات جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ شنائی صوری صورت میں ملے گی جب اس نسخے کو استعمال کیا جائے۔ اگر اس نسخے کو حفاظت سے لپیٹ کر رکھ لیا جائے تو اس سے مرض کو شفا نہیں ہو سکتی۔ اعتراض اس صورت میں حق بجانب قرار پاسکتا ہے جب اس نسخے کو استعمال کیا جائے اور اس کے باوجود مریض اچھا نہ ہو۔ کہا یہ جاتا ہے کہ آج کل اسلام کے لئے دنیا میں اتنا کچھ کیا جا رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان افراد کو دیکھئے یا اقوام کو سب اپنی زبوں حالی کے مرثیہ خواں نظر آتے ہیں۔ اس کا بھی اس کے سوا کیا مطلب لیا جائے گا کہ اسلام توخ انسان تو ایک طرف خود مسلمانوں کی حالت سنوارنے میں بھی ناکام رہا ہے۔ اسے بھی ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ ایک ریل گاڑی غلط کانسٹرکشن سے دو مسری پٹری پر جا پڑی۔ اس ریل گاڑی کے انجن کی رفتار تیز کرنے کے لئے جو کچھ کیا جائے گا اس سے اس کی رفتار تو تیز ہو جائے گی لیکن وہ جتنی آگے بڑھے گی اتنی ہی اپنی حقیقی منزل سے دور پڑتی چلی جائے گی۔ مسلمانوں نے جس وقت خدا کی حکومت کو چھوڑ کر ان لوگوں کی حکومت اختیار کی ان کی گاڑی غلط پٹری پر جا پڑی۔ اب جو کچھ اسلام کی ترقی اور مسرور کے نام سے کیا جاتا ہے وہ غلط پٹری پر پڑی ہوئی ریل گاڑی کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جس قدر یہ گاڑی آگے بڑھتی ہے قرآنی منزل سے دور پڑتی چلی جاتی ہے۔ جب تک اس گاڑی کو اس مقام پر واپس لے کر جہاں سے یہ غلط کانسٹرکشن تھی اسے صحیح پٹری پر نہیں ڈالا جائے گا یہ اپنی منزل مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔ وہ صحیح پٹری ہے لا الہ الا اللہ اور منسلک مقصود ہے لا خوف علیہم ولا هم یحزنون۔

اقبال کے الفاظ میں اسے

بر خود از مشرآں اگر خواہی ثابت  
در ضمیرش دید ام آپ حیات  
می دہد مارا پیام لاتخت  
می رسد بر مقام لاتخت (مثنوی صافرۃ)

## مفسر کا حزن

میں نے اپنے خطاب میں اُس وزن کے متعلق کچھ نہیں کہا جو سب سے زیادہ دل سوز اور جگر پاش ہے۔ جو اب ان کو اُس تپان میں مبتلا کر دیتا ہے جس کی حرارت کوئی تقریباً طبریکار نہیں کر سکتا لیکن جو بڑیوں تک کو جلا کر بھس کر دیتی ہے۔ یہ وہ حزن ہے جس میں دنیا کی کم، زکم، نصت آمیزی مبتلا ہے اور جس کا کوئی علاج کسی کو نہیں سمجھتا۔ یہ حزن ہے روٹی کی محتاجی کا پیدا کردہ۔ یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ عربی زبان میں حزن اس پریشانی کو بھی کہا جاتا ہے جو افلاس اور محتاجی کی پیدا کردہ ہو۔ چنانچہ عرب "حزانۃ الحدیث" انسان کے ان متعلقین (جبری بچوں) کو کہتے ہیں جن کی روٹی کی فکر سے وہ پریشان ہو۔ عربی لغت کی مستند کتاب تاج العروس میں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جنت کے متعلق کہا گیا ہے: "أَلْحَمْدُ لِلَّهِ الْعَظِيمِ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ" (پہلے) تو اس سے مراد یہ ہے کہ قابل حمد و ستائش وہ ذات ہے جس نے ہمیں فکر و معاش سے نجات دلائی۔ لَایَمَسُّنَا فِيهَا أَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ (پہلے) اس نے ایسا نظام قائم کر دیا ہے جس میں نہ ہمیں رزق کے لئے جگر پاش متعلقین اٹھانی پڑتی ہیں اور نہ ہی ذہنی کاوش اور نفسیاتی افسردگی کا شکار ہونا پڑتا۔ قرآنی معاشرہ میں اس قسم کا نظام کس طرح قائم کیا جاتا ہے اس کے متعلق میں گزشتہ چالیس سال سے اسی نکار و اصرار سے لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ اس کے دھرانے کی ضرورت نہیں۔ نظام ربوبیت (یعنی قرآن کا معاشی نظام) میرے مشن کا بنیادی موضوع ہے۔ (اس موضوع پر میری جامع تصنیف کا نام بھی "نظام ربوبیت" ہے) میں اس وقت اس کے متعلق چند اشارات پر اکتفا کر رہا ہوں۔

(۱) اس نظام میں ہر فرد کو روٹی کی نگہاپ نہیں کرنی پڑتی اس میں تمام افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات پر پونے کی ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے۔ وہ اعلان کرتی ہے کہ نَحْنُ حُكْمٌ فَكُمُوهُ وَإِيَّاهُمْ دَعَاؤُكُمْ۔ (ہم تمہاری ضروریات زندہ گی کے بھی دے داریں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔

(۲) اس میں آج اور مہاجر (EMPLOYER AND EMPLOYEE) مزدور اور کارخانہ دار کا شکار اور زمیندار کی آویزش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے اور اپنی محنت کے حاصل میں سے بقدر اپنی ضرورت کے لیکر باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظام برائے مسکن کی تحویل میں دیدیتا ہے۔

(۳) اس طرح اس میں کسی کے پاس دولت جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا مسئلہ۔

(۴) اس میں زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ وہ تمام ان لوگوں کے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے نظام خداوندی اس کا ایسا انتظام کرتا ہے جس سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

(۵) اس میں جو لوگ کسی دہے سے محنت کرنے سے محروم ہوں انہیں خیرات نہیں دی جاتی۔ وہ اپنی ضروریات زندہ گی اپنے حق کے طور پر (AS OF RIGHT) حاصل کرتے ہیں۔ فَيَأْتُوا بِالْحَقِّ مَغْلُوبٌ مَّرْلَسًا اٰلِ وَالْمَغْلُوبُ قَوْمٌ (پہلے)

(۶) چونکہ اس نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہوتی ہے نہ زمینوں کے سربے اس لئے اس میں (TAXES) کے مسائل پیدا ہوتے ہیں نہ بلو (سود یا ستاج) کے۔ نہ زمینوں کے جھگڑے اٹھتے ہیں نہ جائیدادوں کے۔ یہ تمام مسائل اس اسلام کے پیدا کردہ ہیں جو ہمارے دور و مگرہ واری کے زمانے میں وضع ہوا تھا۔ قرآنی نظام میں نہ کوئی بھوکا سوتا ہے نہ ضرورت زیادہ اٹھتا۔ یوں اس نظام میں نہ کسی کو کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ حزن۔ اقبل نے اس نظام کی انفرادیت کو ایک شعر میں بیان کر دیا ہے کہ

کس دریں جا ساںک و محروم نیست  
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

ذکوئی محتاج نہ ساںک۔ نہ آقا نہ غلام۔ نہ حاکم نہ محکوم۔

قریباً اس نظام میں خوف اور حزن کا شائبہ تک بھی باقی رہ سکتا ہے؟ اور جب خوف و حزن باقی نہیں رہتا تو ان سے پیدا شدہ نفسیاتی امراض کا خود بخود اٹلہ ہر جاتا ہے۔ یہ ہے معاشرہ سے اخلاقی ڈراما اور تمدنی جرائم ختم کرنے کا اسلامی نسخہ! والسلام